مسئلہ تملیک فی الزکوٰۃ

از

جناب مرزا محمد یوسف صاحب

اُستاذ عربی مدرسہ عالیہ رام پور (یوپی)

دلائل کی تنقیح

(۶)

(viii) کسی مردہ غریب کا قرضہ صدقۂ زکوٰۃ سے ادا کرنا اس سے زیادہ بے انصافی کا مقتضی ہے۔ اس لئے کہ اس مسئلے کی دو جہتیں ہیں۔

مواخذۂ اخروی کا اندیشہ:۔ اس کے لئے بجائے اس کے کہ فقراء و مساکین کا پیٹ کاٹا جائے یا تو قرض خواہ جو عموماً طبقۂ اغنیاء سے تعلق رکھتے ہیں اس غریب مردہ کو آخرت میں مقروض رکھنے کے بجائے اس دنیا میں معاف کر دیں یا اگر وہ لوگ معاف نہ کریں تو اہلِ خیر مسلمان اس قرضہ کو ادا کر دیں۔

سماج کی معاشی تنظیم:۔ سماج کی صالح تنظیم کے لئے ضروری ہے کہ قرض داروں سے قرض خواہوں کے قرضے چکوانے کا مؤثر انتظام ہو۔ اب غور کیجئے، مانحن فیہ میں کیا ہوگا قرضہ فقراء کے حصے میں چکوایا جائے گا لہٰذا فقراء کا تو پیٹ کٹا اور فائدہ ہوا اغنیاء کا کہ اُن کی ڈوبی ہوئی رقم وصول ہوگئی (اس لئے کہ قرض خواہ عموماً طبقۂ اغنیاء ہی سے تعلق رکھتے ہیں)

لہٰذا اس مسئلہ میں بھی اہلِ انصاف ہی انصاف کریں گے کہ اگر فقہاء نے یہ فتویٰ دیا کہ صدقہ زکوٰۃ سے مردہ کا قرضہ ادا نہیں کیا جا سکتا تو انھوں نے حق و انصاف اور اسلام کی روح کو ملحوظ رکھا یا نہیں مگر جب مزاج سرمایہ داری عہد کی انفرادیت (Individualism) سے متاثر ہو جائے

ہیں تو پھر اسلام کی انصاف کوشی اور انسان دوستی کو مشکل ہی سے درک کر پاتے ہیں۔

(xi) صدقۂ زکوٰۃ سے غلام خرید کر آزاد کرنا سو اس زمانہ میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب اس بحث کی ایک جدلی قیمت رہ گئی ہے۔

زکوٰۃ معاشرۂ اسلامی کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہے مگر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ اس کی ثانوی حیثیت ہے اولاً یہ ایک خالص تعبدی امر ہے اور اللہ تعالیٰ یہ آزمانا چاہتا ہے کہ اُس کے بندے اُس کے حکم کی تعمیل میں مال جیسی پیاری چیز سے کہاں تک دست بردار ہو سکتے ہیں۔ یہ اُن کے تیاگ کا امتحان ہے۔ لہٰذا اگر آدمی کسی نفع عاجل کی خاطر اپنی دولت کو صرف کرے تو یہ تجارت ہے "تیاگ" نہیں ہے تیاگ وہ ہے جس میں کسی نفع یقینی یا نفع موہوم کی امید نہ ہو اور یہی چیز زکوٰۃ میں ملحوظ ہے۔ جس زمانہ میں غلام خریدے اور آزاد کئے جاتے تھے یہ رسم معروف تھی کہ آزاد کنندہ کو غلام کی وِلا حاصل ہو جایا کرتی تھی یعنی اگر غلام لاوارث مرے تو اُس کا ترکہ اُس کے آزاد کرنے والے کو ملے گا۔ اب اگر رقم زکوٰۃ سے غلام آزاد کیا جائے تو اس میں اُس کی ولا زکوٰۃ دہندہ کو حاصل ہو گی یعنی ایک نفع کی اس میں توقع ہے تو پھر یہ تجارت ہوئی "تیاگ" تو نہ ہوا جو امور تعبدی کی جان ہے۔

یہ ہے روحِ اسلام کا تقاضا جس کی بناء پر فقہاء سابقین نے فتویٰ دیا کہ رقم زکوٰۃ سے بردے آزاد نہیں کئے جا سکتے۔ ضمناً تملیک کے اصول کی بھی مراعاۃ ہو گئی۔

(x) وصولئ زکوٰۃ کے مصارف پر رقوم زکوٰۃ کا خرچ ہونا:۔ عاملین علی الزکوٰۃ کے سہم سے جو انکار کرے وہ کافر۔ مگر عامل اور فضولی میں فرق ہے۔ عامل کو جو فقراء کو تحصیلِ زکوٰۃ سے فارغ کر دیتا ہے دو وجہ سے معاوضہ ملتا ہے:

اوّلاً:۔ اُس نے فقراء کو جسمانی طور پر تحصیلِ زکوٰۃ کی کلفت سے فارغ کر دیا۔

ثانیاً:۔ ذہنی طور پر اُس نے فقراء کو فارغ البال کر دیا اور اطمینان دلا دیا کہ رقومِ زکوٰۃ اُن تک ضرور پہنچ جائیں گی۔

فضولی پہلی شرط کو پورا کرتا ہے دوسری کو نہیں[۱] لہٰذا معاوضہ کا مستحق کیوں ہو؟ اور ہر دو بیچ کا بچولیا

---

[۱] کیوں کہ اگر وہ رقوم زکوٰۃ میں تغلب بیجا یا خیانتِ مجرمانہ کرے تو اسے ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کیا ضمانت ہے۔

جسے امام نے اس کام کے لئے مقرر نہ کیا ہو وہ بطور خود اس کام کو اپنے ذمے لے لے وہ فضولی ہے خواہ وہ شخص واحد ہو یا کوئی انجمن و ادارہ ہو الا یہ کہ اُس انجمن یا ادارے نے حکومت کی طرف سے یہ حق حاصل کر لیا ہو۔ اس صورت میں اس انجمن یا ادارے کے متعلق تغلبِ بیجا یا خیانتِ مجرمانہ کا اندیشہ نہیں کیا جا سکتا لہٰذا وہ معاوضہ کا مستحق ہو سکتا ہے۔

غرض نیکی اور خدمتِ خلق کے جن کاموں کی فہرست اصلاحی صاحب نے گنائی ہے اُن میں (بالخصوص پہلے چھے میں) اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ سو فی صدی غریبوں کے مفاد سے متعلق ہیں گے ناممکن ہے کہ غیر غربا رحتیٰ کہ زکوٰۃ دہندہ بھی اُس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر مستفید نہ ہوں۔ اور اگر ایسا ہوا ——— جو ہونا یقینی ہے ——— تو پھر آیت میں جو قصر و حصر ہے اُس کا کیا فائدہ رہا۔ انما کا عمل ذوقِ اجتہاد کی خاطر لغو ہو جائے گا اور پھر اس صورت میں اولاً تو آیت کی بلاغت اور مقتضائے کلام کو بالکل ذبح کر دینا پڑے گا اور ثانیاً انما کا عمل لغو ہونے کے بعد "ومنھم من یلمزک فی الصدقات" اور "انما الصدقات للفقراء" میں کیا ربط رہ جائے گا۔

پھر نیکی اور خدمت خلق کے جن کاموں کی فہرست اصلاحی صاحب نے گنائی ہے وہ سب غریبوں کے مفاد سے متعلق ہے حالاں کہ قرآن و حدیث سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ صدقات زکوٰۃ صرف فقرار کا حق ہیں اور قرآن کے مصطلحہ فقرار اور اردو کے غربا میں زمین آسمان کا فرق ہے نیز مصارف زکوٰۃ کو قرآن نے کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اب اس میں اضافہ کا کسی کو حق نہیں ہے اور تو اور خود پیغمبر اسلام کو بھی اس میں دخیل نہ ہونے کا اعتراف تھا۔ چنانچہ حدیث مشہور ہے جسے امام ابو جعفر الطحاوی نے شرح معانی الآثار میں روایت کیا ہے۔

"حدثنا یونس قال حدثنا ابن وھب قال اخبرنی عبد الرحمٰن عن زیاد بن انعم عن زیاد ابن نعیم انه سمع زیاد بن الحارث الصدائی یقول:۔

امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم علی قومی فقلت یا رسول اللہ اعطنی من صدقاتھم ففعل وکتب لی بذالک کتاباً فاتاہ رجل، فقال یا رسول اللہ

اعطنی من الصدقۃ، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ عزوجل لم یرض بحکم نبی ولا غیرہ فی الصدقات حتی حکم فیھا ھو من السماء فجزأھا ثمانیۃ اجزاء فان کنت من تلک الاجزاء اعطیتک"۔

(طحاوی: شرح معانی الآثار جلد اول صـ۳۰۴-۳۰۵)

حضور نے اس شخص سے پوچھا تھا کہ تو ان اصنافِ ثمانیہ میں سے کسی صنف کے تحت ہے جو میں زکوٰۃ میں سے تیرا حصہ لگاؤں۔ کیا ہم بھی اصلاحی صاحب سے دریافت کر سکتے ہیں کہ نیکی اور خدمتِ خلق کے جن کاموں کی فہرست انھوں نے دی ہے (یہاں تک کہ لاوارث میت کی لاش کی تجہیز و تکفین بھی) وہ ان مصارفِ ثمانیہ میں سے کس کس مصرف کے تحت آتی ہے جو انھیں رقوم زکوٰۃ سے پورا کرنے کی وجہ جواز پیدا ہو سکے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ جب اللہ عزوجل تقسیم زکوٰۃ کے باب میں نبیِ مرسل کے حکم کے ساتھ تو راضی ہوا نہیں بلکہ آسمان سے خود اُس کے باب میں حکم محکم نازل فرمایا تو کیا ہمارے لئے اس حکمِ خداوندی کے بعد گنجائش رہ گئی ہے کہ ہم "زکوٰۃ کے ذریعہ سے نیکی اور خدمتِ خلق کے وہ کام انجام دے سکیں جن میں سے بعض کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے"۔

ختمِ مقال سے پیشتر ایک غلط فہمی کا ازالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شاید بعض قلوب میں خلجان پیدا ہو کہ فقہا اس درجہ ظاہر پرست (Literalist) تھے کہ ایک اصول کی مراعاۃ کی خاطر "زکوٰۃ کے ذریعے سے نیکی اور خدمتِ خلق کے وہ کام بھی انجام نہیں دیتے تھے جو غرباء کی اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہیں"۔ ایسا نہیں ہے۔ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے اور ساتھ ساتھ باضابطہ بھی۔ لہٰذا بیت المال (Public Treasury) کا نظم و ضبط کچھ ضوابط کے ساتھ ہوتا تھا یہ نہیں کہ جو آمدنی ہوتی گئی "کل شیئ فی جوف الفراء" کے مصداق ایک بھنڈار خانہ میں جمع ہوتی رہی اور جیسی خرچ کے لئے ضرورت ہوئی اسی عمرو عیار کی زنبیل میں سے رقم نکالی جاتی رہی۔ جن لوگوں نے عہدِ حاضر کے متمدن ممالک کے مالیات عامہ (Public Finances) کی تنظیم کا مطالعہ

کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آمدنی و خرچ کی مختلف مدات ہوا کرتی ہیں اور ایک مد کی آمدنی نہ دوسری مد میں جمع ہو سکتی ہے اور نہ ایک مد کا خرچ دوسری مد سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی بیت المال کی تنظیم بھی اسی اصول پر ہوئی تھی۔ اس کی تفصیل مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنے مضمون میں بہت اچھی طرح دی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں، مزید تفصیل کے لئے قارئین شمس الائمہ السرخسی کی المبسوط ملاحظہ فرمائیں (الجزء الثالث ص ۱۷-۱۸) لہٰذا نیکی اور خدمتِ خلق کے جن کاموں کا حوالہ اصلاحی صاحب نے دیا ہے اُن میں سے پہلے چھ کے مصارف خراج کی مد سے ادا کئے جاتے تھے اور ساتویں کا صدقہ چوتھی مد سے دیا جاتا تھا۔ یوں اگر اہلِ خیر چاہیں تو زکوٰۃ کے علاوہ اپنی کمائی میں سے اجتماعی فلاح و بہبود اور رفاہِ عامہ کے کاموں کی تعمیر میں خرچ کریں بقول شاعر ؎

پُل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

مگر صدقات زکوٰۃ و عشر کا صرف مصارفِ ثمانیہ پر مقصور ہے۔ نام نہاد نیکی اور خدمتِ خلق کے کسی کام کو فقراء کا پیٹ کاٹ کر انجام نہیں دیا جا سکتا اور اگر کوئی اس کی تجویز کرتا ہے تو اپنے لئے اُس مرتبہ کا مدعی ہے جس سے افضل الانبیاء صلوات اللہ علیہم نے دستبرداری کا اعتراف کیا جیسا کہ ابھی ابھی زیاد بن حارث الصدائی کی حدیث میں بحوالہ طحاوی گذر چکا ہے

غرض مصارفِ زکوٰۃ اور اس کا طریقِ ادا قیامت تک کے لئے مقرر ہو چکا ہے۔ حکم محکم ہے اور کسی ترمیم و اصلاح یا نسخ کا محتمل نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ اصلاحی صاحب باوصف اپنے علم و فضل اور خلوص و دیانتداری کے اسے محض ایک انتظامی معاملہ سمجھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں

"اسلامی حکومت اختیار رکھتی ہے کہ . . . . . . اگر چاہے تو کسی مرکزی اسکیم کے تحت پورے ملک کی زکوٰۃ کنٹرول کر کے اس کو ملک کے غرباء کی کسی نفع بخش اسکیم میں لگا دے جس سے سب کو فائدہ پہنچے"

(ترجمان القرآن جلد ۵۲ عدد ۱ ص ۳۴)

اگر کوئی قرآن و حدیث سے ناواقف شخص ایسا غیر ذمہ دارانہ فتویٰ دیتا تو چنداں حیرت نہ ہوتی مگر یہ ایک ذمہ دار کبیر جماعت کا فتویٰ ہے جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ وہ علوم قرآن و حدیث سے بے بہرہ

نہیں ہیں۔ کاش کہ وہ یہ فتویٰ صادر فرمانے سے پہلے یہ دیکھ لیتے۔

۱۔ حکومتیں غرباء کی نفع بخش اسکیموں ہی کے نام سے مُترفین واہلِ دول کی تجوریاں بھرنے کے لئے ملک کی آمدنی لگایا کرتی ہیں۔

۲۔ زکوٰۃ نہ تو سب غرباء کے فائدے کے لئے ہے اور نہ اس مقصد کے لئے کہ اس کے ذریعے (جیساکہ اصلاحی صاحب فتویٰ دیتے ہیں) سب کو فائدہ پہنچے۔ ورنہ پھر اِنّما کے ذریعے حصر و قصر کا کیا فائدہ ہوا۔

زیاد بن حارث الصدآئی کی حدیث جسے امام طحاوی نے روایت کیا ہے افضل الانبیاء تک سے اس قسم کے اختیارات کو مسلوب کر رہی ہے۔

لیکن اصلاحی صاحب کے ساتھ دقت یہ ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی عظمت و پستی کو اُسی پیمانے سے ناپنا چاہتے ہیں جس سے لادینی حکومتوں کے خوب و ناخوب کی پیمائش کی جاتی ہے اگر اسلام کی کوئی تعلیم اس معیار پر پوری اُترتی ہے تو اپنانے کے قابل ہے ورنہ نہیں۔ فرماتے ہیں۔

"قطع نظر اس سے کہ موجودہ زمانہ کی حکومتیں جو محاصل کی تشخیص و تحصیل کے معاملہ میں جدید نظریات کی معتقد ہیں اور ہر کام کو منصوبہ بندی کے تحت کرنا پسند کرتی ہیں، اس چیز کو اپنا سکتی ہیں یا نہیں اس میں دو نہایت واضح قباحتیں ایسی ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا ایک تو یہ کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو علاقے زیادہ پست حال ہیں وہ برابر پست حال ہی رہیں کم از کم زکوٰۃ کی مد سے ان کی اصلاح و ترقی میں کوئی قابلِ ذکر حصہ نہیں لیا جا سکتا .... دوسری یہ کہ کوئی حکومت کسی منصوبہ بندی کے تحت اپنی زکوٰۃ کی پوری آمدنی کسی ایسی دور رس اور مفید اسکیم پر نہیں خرچ کر سکتی جس سے اس ملک کے پست حالوں اور غریبوں کو بحیثیت مجموعی کوئی مستقل فائدہ پہنچے حالانکہ موجودہ زمانہ منصوبہ بندی کا زمانہ ہے۔"

حالانکہ جیساکہ مقدمہ رابعہ میں بالتفصیل بیان ہو چکا ہے ہمارے ذہنی اضطراب و فکری انتشار کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم لادینی نظاموں کے معیارِ خوب و ناخوب سے دین کے نظام کو جانچنا چاہتے

ہیں۔ لیکن قرآن کا حکم اس باب میں صاف اور غیر مبہم ہے

"ولا تمدن عینیک الی ما متعنا بہ ازواجا منہم زہرۃ الحیوۃ الدنیا لنفتنہم فیہ ورزق ربک خیر وابقی"

مگر مولینا کے دل و دماغ پر اقتصادی منصوبہ بندی (Economic Palanning) اور دور رس تجاویز (Long Term Deve lopmental sche-mes) اس درجہ چھائی ہوئی ہیں کہ انہیں اسوۂ رسول و فرمانِ رسالت کا بھی خیال نہیں۔ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا معیاری طریقہ

"کہ محصلین زکوٰۃ ہر جگہ کھیتوں کھلیانوں اور چراگاہوں میں پھیل جائیں، زکوٰۃ وصول کریں اور وہیں غرباء میں تقسیم کردیں"[1]

جسے اصلاحی صاحب مولانا ظفر احمد صاحب کا من گھڑت بتلاتے ہیں حقیقتاً فرمانِ رسالت

"ان اللہ افترض علیہم صدقۃ توخذ من اغنیاءہم فترد فی فقرائہم"

کی تعبیر اور اسوۂ رسول

"قدم علینا مصدق النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاخذ الصدقۃ من اغنیاءنا فجعلہا فی فقرائنا"

کی پیروی ہے اور اس حیثیت سے

"وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لہم الخیرۃ من امرہم"

کے حسب الارشاد واجب الاتباع اور

"ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"

کے حسب التصریح موجب خیر و فلاح ہے اور

"وعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین"

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۴۰ عدد ا ص ۳۳

کے بموجب واجب الاقتداء ہے۔ لیکن اصلاحی صاحب کی "حرارتِ ایمانی اور جذبۂ سنت پسندی نے اس میں دو واضح قباحتیں ڈھونڈھ لیں جیسا کہ فرماتے ہیں۔

"اس میں دو نہایت واضح قباحتیں ایسی ہیں"

حالانکہ اگر اس قسم کی گستاخی منکرینِ حدیث کی جانب سے ہوتی تو شاید انھیں گردن زدنی گشتنی، سوختنی سبھی کچھ قرار دیا جاتا۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ وانا الیہ راجعون۔

اطالت کلام مانع ہے ورنہ تاریخی شواہد پیش کئے جاتے اور اعداد شمار دیئے جاتے کہ نام نہاد "منصوبہ بندی" ہر جگہ حتی کہ اشتراکی روس میں بھی ناکام رہی اور اسی طرح دور رس مفید اسکیمیں صرف مترفین واہلِ دول کے فائدے کے لئے ہوا کرتی ہیں۔ پھر ایک مردِ مسلمان کا معمول بہ یہی ہے کہ

"وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ"

"اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء"

"وکذالک انزلناہ حکما عربیا ولئن اتبعت اھوائھم من بعد ما جاءک من العلم مالک من اللہ من ولی ولا واق"

اور ہمیں یقین ہے کہ صرف اتباعِ خدا و رسول ہی سے ہماری حیاتِ اخروی کے ساتھ ساتھ حیاتِ دنیوی بھی کامیاب ہو سکتی ہے۔ ہم وہ غلطی نہیں کرنا چاہتے جو اہلِ کتاب نے اتباعِ احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر کی تھی، ہمارا یقین ہے کہ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو اُن کی دنیوی زندگی بھی عظمت و بلندی کی حامل ہوتی۔

"ولو انھم اقاموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم"

غرض اس شوقِ تجدد پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ اصلاحی صاحب نے احکامِ شرعیہ کو وقتی مصالح سمجھ کر اغراض و بے التفاتی کے لئے وجہ جواز پیدا کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں

"سوال یہ ہے کہ ایک انتظامی معاملہ تھا جو محض وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت عمل میں آیا تھا یا شریعت کا قانون ہی یہی ہے کہ

ہر تھانہ بلکہ ہر بستی کی زکوٰۃ اسی تھانہ اور اسی بستی میں تقسیم کردی جائے؟ نہایت واضح دلائل کی روشنی میں میرا رجحان یہ ہے کہ یہ محض ایک انتظامی معاملہ ہے۔"

کاش مولانا وہ "نہایت واضح دلائل" بھی ثبت قلم فرما دیتے جن کی روشنی میں انھیں شریعت کا یہ حکمِ محکم ایک انتظامی معاملہ نظر آرہا ہے! لیکن واقعہ یہ ہے کہ انتظامی اور شرعی کی تدقیق اُن کی اپنی ذہنی اختراع ہے ورنہ حقیقتاً "واضح دلائل" کی روشنی میں بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک شرعی قانون اور حکمِ محکم ہے۔ دلائل سنئے۔

اولاً: حدیث معاذ بن جبلؓ "توخذ من اغنیاءھم و ترد علی فقرائھم" میں اخذ ورد کا حکم بصیغہ مضارع مذکور ہوا ہے جو حال اور مستقبل دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے یعنی جس طرح عہدِ نبوی میں زکوٰۃ لی جاتی اور تقسیم کی جاتی تھی اسی طرح آنے والے معاشروں میں بھی وصول اور تقسیم کی جائے گی۔

ثانیاً: "ولکم فی رسول اللہ اسوۃ" کا مقتضا ہے کہ عہدِ نبوی کی اس سنت کو برقرار رکھا جائے بلکہ صرف سنتِ نبوی پر مبنی اجتماعی تنظیم کا باز احیا رہی قیامِ حکومت اسلامیہ کا مقصو حقیقی ہے۔ اور ترمذی نے جو علی بن سعید الکندی سے روایت کی ہے اُس سے غیر مبہم طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا وہی طریقہ تھا جسے اصلاحی صاحب مولانا ظفر احمد صاحب کی من گھڑت بتا رہے ہیں۔ تو آخر اس اسوۂ رسول کے اتباع اور التزام سنتِ نبوی سے انحراف کی ہمت افزائی کرانے والے کون سے دواعی ہیں۔ محض اس لئے کہ فقراء کے حق سے "حکومتی سطح" کی "ترقیاتی اسکیموں" کو (Finance) نہیں کیا جاسکتا (روپیہ نہیں لگایا جاسکتا) جس سے مترفین و اہلِ دول کی تجوریاں بھر سکیں اُسوۂ رسول کو محض ایک انتظامی معاملہ (وقتی مصلحت) کہہ کر صرفِ نظر کیا جاسکتا ہے۔

ثالثاً۔ اُس تملیکِ اجتماعی کی جو منکرینِ تملیک کے پیشِ نظر ہے، کوئی مثال صدر اسلام میں نہیں مل سکتی۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت کی معاشرتی زندگی اس کے لئے سازگار نہ ہو۔۔۔

. . . . ہوسکتا ہے کہ طرقِ دولت آفرینی (Means of Production) اس وقت محض ابتدائی حالت (Primitive state) میں ہوں اس لئے تقسیم دولت کا وہ پُرپیچ طریقہ جسے "تملیک اجتماعی" کا نام دیا جارہا ہے، اُس عہد میں مستعمل نہ ہو۔ لیکن اس قسم کا استدلال تو ایک مارکسیت زدہ منکر حدیث کے منہ سے امید کیا جاسکتا تھا جس نے مارکس اور اینجلز کے اشتراکی منشور[1] پر ایمان لاکر "افضل الرسل" کو ایک نیم جاگیردارانہ نظامِ معاشرت کا مصلح سمجھنے پر اکتفاء کی ہو لیکن مولانا امین احسن اصلاحی جیسے عالمِ دین سے اس کو توقع نہیں ہوسکتی۔

لیکن اگر بالفرض یہ محض ایک انتظامی معاملہ ہی تھا اور دائمی حکم نہیں تھا بلکہ شریعت میں نام نہاد "تملیک اجتماعی" کی گنجائش ہے تو کم از کم آنے والے زمانے ہی کے لئے اللہ یا اللہ کے رسول نے اس کی جانب اشارہ فرما دیا ہوتا۔ اور اگر ایجابی اشارہ نہ کیا تھا تو کم از کم قرونِ مابعد ہی کے لئے جب کہ طرقِ دولت آفرینی میں اصلاح و ترقی کے پیش نظر دولت و ثروت کی غیر معمولی افراط ہونا مقدر ہوچکی تھی تملیک شخصی پر زور نہ دیا ہوتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ شارع علیہ السلام کو آنے والے زمانہ کی دولت و ثروت کا اندازہ تھا مگر اس دولت و ثروت کی فراوانی کے عالم میں جب کہ اس "عہد کی حکومتیں جدید نظریات کی معتقد ہوں گی" اللہ کے سچے رسول کے پیش نظر "تملیک فقیر" اور "تملیک شخصی" ہی تھی چنانچہ صحیح مسلم میں حارث بن وہبؓ سے روایت ہے

"تصدقوا فیوشك الرجل یمشی بصدقته فیقول الذی اعطیها لو جئتنا بها بالامس قبلتها فاما الآن فلاحاجة لی بها فلا یجد من یقبلها"

دوسری حدیث میں ابوموسیٰؓ سے مروی ہے

"لیأتین علی الناس زمان یطوف الرجل فیه بالصدقة من الذهب ثم لایجد احداً یأخذها منه"

---

[1] Communist manifesto.

تیسری روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس میں غیر مبہم طریقہ پر زکوٰۃ کا ذکر ہے کہ وہ بغیر تملیکِ شخصی کے ادا نہیں ہو سکتی۔

"لا تقوم الساعۃ حتی یکثر المال ویفیض حتی یخرج الرجل بزکاۃ مالہ فلا یجد احداً یقبلھا منہ"

پس اگر یہ محض ایک انتظامی معاملہ تھا جو وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت عمل میں آیا تھا جیسا کہ امین احسن صاحب کا خیال ہے اور آئندہ کے لئے شریعت کا ناقابلِ تنسیخ حکم نہیں تھا تو قربِ قیامت میں زکوٰۃ دہندہ کو اس دردسری کے دینے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ مال زکوٰۃ لے کر فقیر کو ڈھونڈھتا پھرے اور ایک نہ لے تو دوسرے کی اور دوسرا نہ لے تو تیسرے کی خدمت میں وہ پیشکش پیش کرتا پھرے کیوں نہ اس کا حکم دے دیا یا اشارہ کر دیا کہ وہ اسٹیٹ کو یا کسی انجمن و ادارے کو اپنی زکوٰۃ دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے اور وہ اسٹیٹ یا پبلک ادارہ اس طرح کی رقموں کو "ایک مرکزی اسکیم کے تحت میں کنٹرول کر کے کسی ترقیاتی منصوبہ (developmental scheme) یا رفاہِ عامہ کے کاموں میں لگا دے"۔

لیکن شارع علیہ السلام کو کبھی یہ نام نہاد "تملیکِ اجتماعی" مقصود ہی نہیں تھی۔ ان کے پیشِ نظر اپنے زمانہ سے لے کر قیامِ قیامت کے زمانہ تک ادائے زکوٰۃ کی جو شکل تھی وہ یہی تھی کہ

"آدمی اپنا مالِ زکوٰۃ لے کر خود نکلے اور مستحق کو ڈھونڈھتا پھرے اور جب ایک انکار کر دے تو دوسرے کو تلاش کرے خواہ اس میں اسے کتنی ہی دردسری کیوں نہ برداشت کرنی پڑے"۔

غالباً اس منصوص حکمِ نبوی کے بعد اس بات کے وہم کے لئے کوئی گنجایش نہیں رہتی کہ عہدِ نبوت و زمانۂ صحابہ کی

"توخذ من اغنیاءھم وترد علی فقرائھم"

کی عمومی پالیسی وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت محض ایک انتظامی معاملہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ حدیث کا سیاق پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ شارع علیہ السلام کے پیشِ نظر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

ادائیگی زکوٰۃ کے سلسلے میں تملیکِ شخصی یا تملیکِ فقیر ہی کا اصول تھا۔

غالباً اصلاحی صاحب "تملیک فقیر" کے انکار پر جو اصرار فرما رہے ہیں اُس کا منشا یہ ہے کہ وہ "نیکی اور خدمتِ خلق کے تمام کاموں کو" رقوم زکوٰۃ سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے موقف کو مضبوط بنانے کے لئے آیت کریمہ کے آخر میں جو "وفی سبیل اللہ" کا ذکر ہے اس پر خصوصیت سے زور دیا ہے فرماتے ہیں

"فی سبیل اللہ کی مد ایک وسیع مد ہے۔ اس میں نیکی اور بہبودی کے سارے ہی کام داخل ہیں.... اگر اس کے تحت تمام مصارف خیر آتے ہیں جیسا کہ ہر مسلک کے علماء اور ائمہ نے تصریح کی ہے تو تملیکِ شخصی کا تو ان ساری صورتوں میں پایا جانا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر ممکن ہے تو تملیکِ اجتماعی کا پایا جانا ممکن ہے اور اس سے ہمیں اختلاف نہیں ہے۔ پس اگر بالفرض کسی چیز کے جواز میں اس پہلو سے کسی کو تردد ہے کہ للفقراء کی لام کے یہ منافی ہے تو اس کو چھوڑیئے۔ یہ دیکھئے کہ وہ فی سبیل اللہ کی مد کے تحت آتی ہے یا نہیں۔ اگر آتی ہے تو اس کے جواز کی یہ دلیل کافی ہے۔"

(ترجمان القرآن جلد ۵۴ عدد ۱ ص ۵۶-۵۷)

"فی سبیل اللہ" کی توضیح ہمیں اصل بحث سے دور لے جائے گی لہٰذا اس سے صرفِ نظر مناسب ہے۔ اسے کسی اور وقت کے لئے رہنے دیجئے لیکن اصلاحی صاحب نے جو فرمایا ہے کہ "اس کے تحت تمام مصارفِ خیر آتے ہیں جیسا کہ ہر مسلک کے علماء و ائمہ نے تصریح کی ہے" محلِ نظر ہے۔ شاید ہی کسی نے آیت کریمہ "انما الصدقات للفقراء" میں "وفی سبیل اللہ" سے مراد تمام مصارفِ خیر کو لیا ہو۔ القدوری میں ہے۔

"وفی سبیل اللہ المنقطع الغزاۃ"

المبسوط میں شمس الائمہ السرخسی نے فرمایا ہے

"واما قولہ تعالیٰ وفی سبیل اللہ فھم الفقراء الغزاۃ ھٰکذا قال ابو یوسف"

آگے چل کر انھوں نے اسے صاف کر دیا۔

«وابویوسف رحمہ اللہ تعالیٰ بقول الطاعات کلہا فی سبیل اللہ تعالیٰ ولکن عند اطلاق ھذا اللفظ المقصود بہم الغزاۃ عند الناس»

دیگر مسالک کے متعلق امام شعرانی نے «المیزان» میں لکھا ہے

«ومن ذالک قول الائمۃ الثلاثۃ ان المراد بقولہ تعالیٰ وفی سبیل اللہ الغزاۃ مع قول احمد فی اظہر روایتہ ان منہ الحج» (المیزان للشعرانی صج ۲ ۱۳)

یعنی امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک کہتے ہیں کہ فی سبیل اللہ سے مراد غزاۃ ہیں اور امام احمد بن حنبل حج کو بتاتے ہیں یعنی مجموعی طور پر تمام ائمہ کے نزدیک فی سبیل اللہ سے مراد غزاۃ اور حجاج ہیں نہ کہ جملہ مصارف خیر۔

اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ قاضی ابوالولید ابن الرشد نے بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد میں فرمایا ہے جو نقل مذاہب کے باب میں نہایت مستند اور معتمد علیہ کتاب ہے۔

«واما فی سبیل اللہ فقال مالک سبیل اللہ مواضع الجہاد والرباط وبہ قال ابوحنیفۃ وقال غیرہ الحجاج والعمار وقال الشافعی ھو الغازی جار الصدقۃ وانما اشترط جار الصدقۃ لان عند اکثرھم انہ لایجوز تنقیل الصدقۃ من بلد الی بلد الا من ضرورۃ»

(بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد جلد اول ص۲۳۷)

اس میں امام مالک کا مذہب خصوصیت سے قابلِ غور ہے کہ وہ فی سبیل اللہ سے بالتصریح مواضع جہاد و رباط مراد لیتے تھے لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اصلاحی صاحب نے توطیدِ مقصد اور سخن پروری کی خاطر غلط بیانی اور کتمانِ حق سے بھی دریغ نہیں کیا۔ انھوں نے قاضی ابن العربی مالکی کی کتاب «احکام القرآن» کا ایک اقتباس نقل کیا ہے :۔

«قال مالک سبل اللہ کثیرۃ۔ احمد واسحٰق قالا انہ الحج

فی سبیل اللہ کے متعلق امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ اللہ کے راستے بہت سے ہیں۔ امام احمد

والذی یصح عندی من قولهما اور اسحاق کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حج ہے

ان الحج من جملۃ السبل مع الغزو" لیکن میرے نزدیک ان کے قول کا صحیح منشاً

یہ ہے کہ حج بھی جہاد کی طرح اللہ کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے۔ (ترجمان القرآن جلد ۴۵ عدد ۱ صفحہ ۵۵)

لیکن مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ قارئین کرام کے سامنے یہ حقیقت پیش کرنی پڑ رہی ہے کہ اصلاحی صاحب نے احکام القرآن کی عبارت میں سے سخن پروری اور توطیدِ مقصد کی خاطر ایک پورا ٹکڑا حذف کر دیا ہے اور حذف کرنے کا کوئی اشارہ (مثلاً نقطے) بھی نہیں کیا۔ ہم اسے کاتب کے تصرف یا سہوِ قلم پر ہی محمول کر لیتے مگر انھوں نے ترجمہ بھی اپنی کتر بونت کی ہوئی عبارت کا کیا ہے۔ احکام القرآن کے الفاظ یہ ہیں۔

"(المسئلۃ التاسعۃ عشر) قولہ وفی سبیل اللہ قال مالک سبل اللہ کثیرۃ ولکن لا اعلم خلافاً فی ان المراد بسبیل اللہ ھاھنا الغزو من جملۃ سبیل اللہ الا ما یؤثر عن احمد واسحٰق فانھما قالا انہ الحج والذی یصح عندی من قولھما ان الحج من جملۃ السبل مع الغزو لانہ طریق بر فاعطی منہ باسم السبیل وھذا یحل عقد الباب ویخرم قانون الشریعۃ وینثر مسلک النظر وما جاء قط باعطاء الزکوٰۃ فی الحج اثر"

(احکام القرآن لابن العربی جلد اول صفحہ ۳۹۶)

اس میں سے اصلاحی صاحب نے دو جگہ سے خط کشیدہ عبارت اڑا دی کیوں کہ اس کے ہوتے ہوئے ان کی عمارتِ استدلال زمین پر آ رہتی۔ لیکن اس کتر بونت میں انھیں یاد نہ رہا کہ احمد و اسحٰق قالا کا جملہ ماسبق سے ربط رکھنے کے لئے کوئی اور عبارت بھی درکار ہے۔

اس تصرفِ بے جا کی توقع ایک عالم تو درکنار ایک عامی سے بھی نہیں کی جا سکتی۔

"فانا للہ وانا الیہ راجعون"